© rasailojaraid.com

پاکستانی کلچر کے سرچشمے یا عبرت کدے؟

● اوریا مقبول جان ● شاہ نواز فاروقی ● عنایت علی خاں ● ممتاز احمد ● مسلم سجاد

پاکستان کا قیام: کسی علاقائی امتیاز، جغرافیائی اساس، لسانی انفرادیت یا نامعلوم تاریخی اَدوار و آثار کی نسبت سے عمل میں نہیں آیا تھا۔ پاکستان کا قیام: کلمہ طیبہ، اسلامی تہذیبی وحدت، اور اسلامی قومیت کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا۔لیکن تشکیل پاکستان کے کچھ ہی عرصے بعد دیگر مشکلات کے ساتھ مملکت خداداد کو ایک ہمہ پہلو نظریاتی حملے کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ یہ حملہ تحریکِ پاکستان کی مسلمہ نظریاتی اساس کا رُخ موڑنے، اسے علاقائی لسانی جھمیلوں میں اُلجھانے اور اس کا تعلق ماضی بعید کے نامعلوم اَدوار سے جوڑنے کے بظاہر معصومانہ کھیل سے شروع کیا گیا ہے۔مگر اس قدیم اور افسانوی تہذیب یا ثقافت کا اسلامی تہذیب و ثقافت، اور اسلامی فکر و طرزِ زندگی سے کچھ بھی تعلق نہیں بنتا۔ کچھ سادہ لوح لشکری بھی اپنی زبان، قلم اور فن کے ہتھیار لے کر اس ثقافتی حملہ آور فوج کے ساتھ شامل ہوگئے ہیں۔ ان ثقافتیوں کو ابلاغی اور سیاسی کمک تقویت پہنچارہی ہے۔ اس طرزِ فکر کو نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ ہڑپہ، موئن جودڑو اور ٹیکسلا کے کھنڈرات انسانی تاریخ کے عبرت کدے ہیں، ان سے نسبت جوڑنے والے انھی ثقافتی مضمرات کے حوالے سے یہاں پانچ مختصر مضامین یک جا پیش کیے جارہے ہیں، جن سے مسئلے کی نوعیت واضح ہوگی اور پتا چلے گا کہ ثقافت سے اظہارِ محبت کا اصل مقصد کیا ہے۔(مرتب: سلیم منصور خالد)

❑ بدترین انجام کے منتظر!

اوریا مقبول جان

اُردو ادب کے ایک خوب صورت افسانے کی کہانی ایک ایسے گاؤں کے گرد گھومتی ہے، جس کے باسی بارش کے پانی سے اپنی محدود زمینیں آباد کرتے ہیں۔ بارشیں رُک جائیں تو قحط سالی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آجاتی ہے، جمع شدہ اناج سے گزربسر کی جاتی ہے، یا پھر کچھ عرصے کے لیے شہر کی جانب ہجرت کر کے محنت مزدوری سے پیٹ پالا جاتا ہے۔ بارانی علاقے کی اس زمین پر مٹی کے بہت سے بڑے بڑے ڈھیر ہیں، جنھیں ٹبے کہا جاتا ہے۔ ان ٹبوں کے بارے میں لوگوں کا یہ گمان ہے کہ یہاں کبھی انسان رہا کرتے تھے، شہر آباد تھے، لیکن وقت نے انھیں کھنڈر کر دیا۔ قحط سالی کے زمانے میں آثارِ قدیمہ کے ماہرین کی ایک ٹیم یہاں کے ایک ٹبے کے گرد پڑاؤ ڈالتی ہے اور گاؤں میں سے چند لوگوں کو کھدائی کے لیے مزدور رکھ لیتی ہے۔ ایک فاقہ زدہ غریب شخص بھی ان مزدوروں میں شامل ہو جاتا ہے۔ دن بھر کھدائی کے بعد وہ رات کو مزدوری لے کر گھر آتا ہے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ اسے لگتا ہے کہ اب غربت کے دن رخصت ہو گئے۔ بیوی اکثر اس سے سوال کرتی ہے کہ تم وہاں کھدائی کرتے ہو، آخر وہ لوگ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟ پہلے پہل تو اسے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ مٹی کے اندر سے ٹوٹے برتنوں کے ٹکڑے، سکّے یا کوئی اور استعمال کی چیز مل جائے تو فوراً اسے ماہرِ آثارِ قدیمہ کے سامنے لا کر پیش کر دیا جاتا۔ وہ اسے صاف کرتا، 'ڈسٹلڈ واٹر' سے دھوتا اور اپنے سامنے رکھی ہوئی چیزوں پر ترتیب سے رکھ دیتا۔ مزدور اپنی کھدائی میں مصروف رہتے، جب کہ وہ بڑے بڑے محدب عدسوں کے ذریعے ان ٹھیکریوں کا بغور مطالعہ کرتا رہتا۔ کھدائی کا عرصہ طویل ہوتا گیا، ان چند مزدوروں کے گھر میں خوش حالی آ گئی، لیکن اس مزدور کی بیوی کے سوال ختم نہ ہوئے۔ وہ پوچھتی: یہ لوگ پاگل ہیں، آخر کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟ ان ٹوٹے ہوئے برتنوں سے انھیں کیا ملے گا؟ خود اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آتا تھا تو بھلا وہ بیوی کو کیا بتاتا!

آخر اسے وہاں موجود ماہرین کی باتوں سے پتا چلنے لگا کہ یہ لوگ تین چار ہزار سال پرانے اس شہر میں بسنے والے لوگوں کے زیر استعمال اشیا کی تلاش میں ہیں۔ ان میں سب سے اہم ایک بہت بڑا مٹکا ہے، جس کے گیارہ ٹکڑے دریافت ہو چکے ہیں اور بارھویں کی تلاش جاری ہے، تاکہ مٹکا مکمل ہو جائے۔ تلاش طویل ہو جاتی ہے، وہ ٹکڑا نہیں ملتا، مگر مزدوروں کا رزق چلتا رہتا ہے۔ اچانک شور اُٹھتا ہے کہ وہ ٹکڑا مل گیا۔ ٹکڑا لا کر اس بڑی سی میز پر رکھ دیا جاتا ہے۔ ایک دم خوشی و مسرت کی کیفیت میں ماہرین رقص کرنے لگتے ہیں۔ ان سب کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ معمول کے مطابق اگلے دن صبح مزدور کام پر آتے ہیں تو ماہرین کا سامان باندھا جا رہا ہوتا ہے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گاڑیاں تیار کھڑی ہوتی ہیں، وہ ان سب مقامی مزدوروں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور کچی سڑک پر دھول اُڑاتے غائب ہو جاتے ہیں۔

یہ شخص مایوس گھر واپس لوٹتا ہے۔ قحط سالی اب بھی قائم ہے۔ چند دن بچی کھچی آمدن سے گھر کا گزارا چلتا ہے، پھر فاقے شروع ہو جاتے ہیں۔ پریشان حال وہ شخص گھر کے صحن میں بیٹھا سوچوں میں گم ہے، بیوی اسے مزدوری ڈھونڈنے کے لیے کہتی ہے۔ کتنے دن اس لڑائی، ناکامی اور نامرادی میں گزر جاتے ہیں۔ نہ بارش برستی ہے، نہ مزدوری ملتی ہے اور نہ فاقے ختم ہوتے ہیں۔ ایک دن وہ سخت پیاس کے عالم میں گھڑونچی پر رکھے ہوئے گھڑے کے پاس پانی پینے کے لیے آتا ہے۔ پانی پی کر گھڑا اُٹھاتا ہے اور اسے گھر کے باہر زور سے پٹخ دیتا ہے۔ بیوی غصّے سے پاگل ہو جاتی ہے۔ کہتی ہے: 'ایک تو گھر میں پیسے نہیں، اُوپر سے تم نے پانی بھر کے لانے والا گھڑا بھی توڑ دیا'۔ اس مزدور کا جواب ثقافت کے ٹھیکے داروں کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ ہے۔ وہ اپنی بیوی سے کہتا ہے: 'آج سے تین ہزار سال بعد جب یہ گاؤں ایک ٹبہ بن چکا ہوگا تو ایسے ہی ماہرین آثارِ قدیمہ آئیں گے اور مزدوروں کو اس گھڑے کے ٹکڑوں کی تلاش میں لگائیں گے۔ یوں کتنے لوگوں کو مزدوری مل جائے گی'۔

ثقافت کے رنگارنگ منظر کی یہ کہانی دنیا میں ہر اس حکمران نے دہرائی ہے، جسے عوام کے دُکھوں سے کوئی دل چسپی نہ ہو، لیکن وہ چند دن کے میلوں ٹھیلوں میں ان کو مصروف کر کے اپنے اقتدار کو طول دینا چاہتا ہو۔ میکاوَلی نے اپنی مشہور عالم کتاب Prince (شہزادہ) میں بادشاہوں کو جو مشورے دیے، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ بار بار میلوں، ٹھیلوں اور رنگارنگ تقریبات کا انعقاد کیا جائے تاکہ اس عرصے میں لوگ اپنی غربت و افلاس کے دکھوں کو بھول جائیں۔ پورا روم جب اپنی ترقی کے عروج پر تھا تو عام آدمی کی زندگی انتہائی تلخ اور مشکل تھی، لیکن اشرافیہ کے گھر کے فواروں میں بھی خوشبودار پانی استعمال ہوتا تھا۔ ان کے ہاں تہذیب و ثقافت کے نام پر ہر وقت بڑی بڑی تقریبات کا اہتمام ہوتا رہتا تھا، لیکن ان غریب عوام کو چند دن تقریبات کے کھلونے سے بہلانے کے لیے رومن کھیلیں منعقد کی جاتی تھیں، جن میں بگھیوں کی دوڑ کا مقابلہ سب سے بڑا تماشا ہوتا تھا۔ اس کے لیے دریاے نیل کے ساحلوں سے باریک ریت بحری جہازوں میں منگوائی جاتی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس بڑے اسٹیڈیم میں بچھائی جاتی۔ صرف یہی نہیں، ہر سال تقریباً ۱۲۰۰ مجرموں کو بھوکے شیروں کے سامنے ڈالا جاتا۔ ہاتھیوں، گینڈوں، بیلوں، چیتوں اور جنگلی سوروں کی لڑائیاں ہوتیں۔ ۲۰۰ خوب صورت دوشیزاؤں کو پاگل نوجوانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا۔ قیدیوں کو خوراک کھلا کر پالا جاتا، ورزش کروائی جاتی۔ پھر ان کو بھوکے شیروں سے لڑنے کو کہا جاتا۔ اسٹیڈیم میں ہزاروں افراد بیٹھے یہ تماشا دیکھتے۔ جب تک جشن چلتا، لوگوں کو مفت کھانا ملتا۔ یہ چند دن ایسے گزرتے جیسے پورے روم میں کوئی دُکھ نہیں، بھوک ہے نہ غربت، ننگ ہے نہ افلاس۔ سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اس زمانے کے دانش ور، قلم کار، شاعر اور ادیب ان کھیلوں کو روم کی ثقافت کا مظہر قرار دیتے، اسے ترقی کی بنیاد اور مذہبی جکڑبندیوں سے آزادی کا زینہ تصور کرتے تھے۔

لیکن ان رنگا رنگ تقریبات کے مدح خوانوں کے درمیان ایک فلاسفر سینیکا دی ینگر بھی تھا۔ وہ ان ثقافتی بے ہودہ تقریبات کا مخالف تھا۔ اسے اپنے اردگرد بھوک، ننگ، افلاس اور غربت نظر آتی تو چیخ اُٹھتا۔ وہ سمجھتا کہ یہ سب اس بھوکی ننگی قوم کے ساتھ مذاق ہے۔ وہ ان تقریبات میں شرکت نہ کرتا بلکہ اپنے گھر میں بیٹھا ان دنوں میں روتا رہتا۔ اس کے بہت سے مداح پیدا ہوگئے، یہاں تک کہ روم کے وزیراعظم کے عہدے کے برابر فرد جسے ٹرابیون کہتے تھے، وہ بھی اس کے مداحوں میں شامل ہوگیا۔ بادشاہ کو فلسفی سینیکا کی مقبولیت کا علم ہوا تو اسے دربار میں طلب کر کے اس سے پوچھا گیا کہ: 'تم ان ثقافتی تقریبات کو کیا سمجھتے ہو؟' اس نے کہا: 'یہ ایک مذاق ہے، جو غربت میں پسی ہوئی قوم کے ساتھ کیا جا رہا ہے'۔ بادشاہ نیرو نے حکم دیا کہ: 'تمھاری سزا یہ ہے کہ تم بھرے دربار میں اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو قتل کرو۔ دربار کے سناٹے میں وزیراعظم نے اس کی سفارش کی، لیکن ثقافت کے اس 'دشمن' اور روم کی 'تہذیبی روایات کے مخالف' کی جان کیسے بخشی جاسکتی تھی۔ اور ۶۵ عیسوی میں سینیکا نے بھرے دربار میں جبری خودکشی کر لی۔ لیکن تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ یہ رنگا رنگ تقریبات روم کے بادشاہوں کو بدترین انجام سے نہ بچاسکیں۔ ان پر شمالی افریقہ کے تہذیب سے ناآشنا قبائل ایسے چڑھ دوڑے کہ بڑے بڑے ثقافتی مراکز کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور آج وہ عبرت کے نشان کے طور پر موجود ہیں۔ تاریخ اس بات کی بھی شاہد ہے کہ اس سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتا۔ کسی کو موہن جو دڑو (مر جانے والوں کے ٹبے) میں میلے

© rasailojaraid.com